© rasailojaraid.com

مقالات

اسلامی قانون معیشت

اسکی روح اور اسکے اصول

(۲)

(از افادات حضرت شاہ ولی اللہ دہلوی)

ماخوذ از حجۃ اللہ البالغہ ابواب ابتغاء الرزق

چند اصولی پابندیاں مذکورۂ بالا حدود کے علاوہ چند اصولی پابندیاں اور ہیں جو تجارتی معاملات پر عائد کی گئی ہیں آگے بڑھنے سے پہلے ایک سرسری نگاہ ان پر بھی ڈال لینی چاہیے:

ناجائز شرطیں باطل ہیں بیع مشروط کے متعلق بعض مخصوص احکام اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ یہاں ایک عام اور اصولی بات بیان کردی جاتی ہے۔ شارع کا فرمان ہے کہ "ہر وہ شرط جو کتاب اللہ میں نہیں ہے، باطل ہے۔" لیکن اس کا مدعا یہ نہیں ہے کہ ہر وہ شرط جس کی قرآن میں صریح اور منصوص اجازت موجود نہیں ہے، باطل ہے۔ بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو شرط قرآن میں تصریحاً ممنوع قرار دے دی گئی ہے یا جو روح قانون اسلامی کے مخالف ہو، وہ شرط باطل اور ناجائز ہے۔

حقوق ولایت کی بیع ناجائز ہے حقوق ولایت کا بیچنا اور ھبہ کرنا اسلام میں قانوناً ناجائز ہے۔ کیونکہ قابل خرید و فروخت صرف وہی چیز ہو سکتی ہے جو حسی اور مشاہد ہو۔ ولایت کے حقوق کی نوعیت یہ نہیں ہے۔ وہ تو ایک ذہنی اور اضافی چیز ہے۔ نیز ولایت نسب کے تابع ہے۔ جس طرح نسب کی بیع اور ھبہ جائز نہیں اسی طرح ولایت کی بیع اور اس کا ھبہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

بھی جائز نہیں۔

لین دین میں قسم کھانے کی ممانعت تجارتی کاروبار میں بات بات پر قسم کھانا ایک عام شیوہ سا ہو گیا ہے۔ یہ ایک نہایت ذلیل حرکت ہے۔ اس میں برائی کے دو پہلو ہیں، ایک تو فریق ثانی کو اس کے ذریعہ دھوکا دیا جاتا ہے اور دوسرے اللہ کا نام ایک کھیل بن جاتا ہے اور اس کی حقیقی عظمت کا احساس ہمارے دلوں سے فنا ہو جاتا ہے۔ اس لیے شارع نے فرمایا ہے کہ الحلف منفقة للسلعة ممحقة للبركة (تجارت میں قسم کھانا اگر مال کی نکاسی کا ذریعہ ہے تو کمائی میں بے برکتی کا بھی ذریعہ ہے) اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے۔ اسلام اپنے پیروؤں میں اس مذموم رسم اور عادت کا کوئی ہلکا سا اثر بھی دیکھنا پسند نہیں کرتا اور حکم دیتا ہے کہ "اے تجارت پیشہ لوگو خرید و فروخت کرتے وقت زبان سے بہت سی فضول باتیں اور ناروا قسمیں نکل جایا کرتی ہیں اس لیے بیع کے ساتھ کچھ صدقہ بھی دیا کرو" صدقہ کا حکم اس لیے دیا گیا تاکہ وہ ان فضول گوئیوں اور غلطیوں کا کفارہ ہو جائے۔

سونے اور چاندی کے سکوں کا مبادلہ اگر کوئی شخص اپنی چیز کو دینار (سونے کے سکے) کے حساب سے بیچتا ہے لیکن دینار کے بجائے دراہم (چاندی کے سکے) لیتا ہے تو قانون اسلام اسے اس کی اجازت دیتا ہے لیکن دو شرطوں کے ساتھ۔ ایک تو یہ کہ دراہم کی قیمت وہی مانی جائے جو اس روز بازار میں تھی۔ دوسری یہ کہ فریقین معاملہ اسی وقت چکتا کریں، یعنی جدا ہونے سے پہلے ان کے درمیان کوئی بات تصفیہ طلب نہ رہ گئی ہو۔ مثلاً اس امر کا تصفیہ کہ کتنے دیناروں کے قائم مقام کتنے درہم ہوں گے، صرافوں پر چھوڑ دیا گیا ہو یا اسی قسم کی کوئی اور بات زمانہ مستقبل میں طے ہونے کے لیے اٹھا رکھی گئی ہو۔ اگر ان شرطوں کو پورا نہ کیا جائے تو بائع کو اس کی اجازت نہیں کہ دینار کے بجائے قیمت میں دراہم لے کیونکہ یہ صورت نزاع پیدا کر دینے کا احتمال رکھتی ہے اور اس سے معاملہ صاف اور یکسو نہیں ہونے پاتا۔

ناپ تول میں کمی کی ممانعت ناپ تول میں ڈنڈی مارنے کی سخت ممانعت ہے۔ رسول اللہ صلعم نے ناپنے تولنے والوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ تم دو ایسی چیزوں (ناپنے اور تولنے) کے مختار اور ذمہ دار بنائے گئے ہو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

جن کے ذریعہ بہت سی پچھلی قومیں ہلاک ہوگئیں" یعنی ناپنے تولنے میں عدل اور قسط کا پورا پورا لحاظ کرنے کی وجہ سے کتنی ہی قومیں ہلاک ہوچکی ہیں مثلاً قوم شعیب، جس کا عبرتناک حشر قرآن میں لکھا ہوا موجود ہے۔ پس ہر مسلمان کو اس خیانت اور بدمعاملگی سے بچنا چاہیے۔

نرخوں کا حکماً مقرر کیا جانا تجارتی کاروبار میں ایک سوال حکومت کے اختیارات کا آتا ہے کہ آیا وہ اشیاء کی قیمت کا جبری تعین کرسکتی ہے جس کے مطابق بیچنے پر اہل تجارت مجبور ہوں؟ اسلامی قانون تجارت کا رجحان اس طرف ہے کہ تجار اس معاملہ میں آزاد ہیں۔ حکومت کو ان کی آزادی میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے۔ چنانچہ ایک بار لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کی کہ تاجروں نے چیزوں کا بھاؤ بہت چڑھا دیا ہے، آپ ان کی قیمتوں کا مناسب تعین فرمادیں۔ آنحضور صلعم نے فرمایا کہ "قیمتوں کا مقرر کرنا اور روزی کا گھٹانا بڑھانا اللہ کے اختیار میں ہے، اور میں نہیں پسند کرتا کہ میں خدا سے اس حال میں ملوں کہ کسی پر ظلم کرنے کا بار میری گردن پر ہو اور وہ اس کے حضور دادرسی کرے" اس کی وجہ یہ ہے کہ کوئی ایسا عادلانہ نرخ معین کرنا جو تاجر اور خریدار دونوں کے نفع نقصان کے لحاظ سے بالکل ٹھیک ہو حتیٰ کہ کسی کی ایک ذرہ برابر حق تلفی نہ ہو، تقریباً ناممکن ہے، اسی لیے آنحضور صلعم نے اس کے لیے کوئی حکم صادر کرنے سے اجتناب فرمایا تاکہ آئندہ چل کر امراء اور حکام اس حکم کو اپنے لیے سند نہ بنالیں اور اس کی آڑ میں جب چاہیں اور جس قدر چاہیں چیزوں کی قیمت گھٹا بڑھا دیں۔ تاہم اگر کھلم کھلا تجارت پیشہ لوگ لوٹ ہی پر اتر آئیں اور چیزوں کو بہت گراں کرکے لوگوں پر عرصہ حیات تنگ کردیں تو حکومت کے لیے جائز ہے کہ رفاہ عام اور مصالح تمدن کے پیش نظر انہیں اس خود غرضانہ لوٹ کھسوٹ سے باز رکھ کر چیزوں کی قیمتیں متعین کردے۔

احکام بیع اب تک جو اصول ہم نے بیان کیے ہیں ان کا تعلق اسلامی قانون تجارت کے سلبی پہلو سے تھا۔ یعنی یہ کہ تلاش معاش کی جدوجہد میں لوگوں کو کن کن تجارتی طریقوں سے بچنا چاہیے۔ اب ہم اس قانون کے اثباتی پہلو پر ایک اجمالی گفتگو کرکے بتائیں گے کہ شارع علیہ السلام نے مختلف موقعوں پر تجارتی معاملات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں کیا ہدایات فرمائی ہیں ۔

(۱) اگر کوئی شخص درخت خریدے اور اس پر پھل بھی لگے ہوئے ہوں تو وہ پھل بیع میں شامل نہ سمجھے جائینگے چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "اگر کوئی شخص کھجور کا درخت خریدے تو اس پر لگی ہوئی کھجوریں معاملہ بیع میں شامل نہ ہونگی بلکہ وہ بیچنے والے کی ملک باقی جائینگی الا یہ کہ درخت خریدتے وقت اس نے ان کھجوروں کو بھی معاملہ بیع میں منسوب کرنے کی تصریح کردی ہو" کیونکہ اصلاً معاملہ تو اس درخت کا ہو رہا ہے اور یہ پھل اس سے ایک زائد چیز ہے جو خریدار کی ملک میں آنے سے پہلے درخت پر لگی تھی، لہذا اس کی حیثیت اس مال واسباب کی سی ہے جو کسی گھر کے صحن میں پڑا ہوا ہو۔ ظاہر ہے کہ صحن یا گھر کی خرید و فروخت کا اثر اس مال پر کچھ نہیں پڑسکتا۔

اس سے یہ قاعدہ نکلتا ہے کہ اصل کی بیع میں فرع شامل نہ ہوگی جب تک کہ فرع کے متعلق معاملہ میں تصریح نہ ہو۔

(۲) اگر کوئی شخص کسی چیز کو خریدتا ہے اور کچھ روز کے بعد اس کے کسی عیب پر مطلع ہو کر واپس کر دیتا ہے تو اس صورت میں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس مدت میں جو نفع اس نے اس چیز سے اٹھایا ہے، مثلاً اگر مکان تھا تو اس کا کرایہ وصول کیا ہے، اس کے بارے میں کیا فیصلہ ہونا چاہیے۔ آیا اس چیز کے ساتھ وہ نفع بھی اصل مالک کو لوٹانا چاہیے یا نہیں؟ اسلام نے اس باب میں یہ اصول مقرر کیا ہے کہ "الخراج بالضمان (یعنی نفع اسی کا ہے جو نقصان کا ذمہ دار ہو) اس قاعدہ کی رو سے نفع کا مستحق خریدار ہے کیونکہ وہ اس چیز کا اس مدت میں ضامن رہا ہے۔ اگر وہ چیز اس کے قبضہ کے زمانہ میں ضائع ہوگئی ہوتی تو وہی نقصان اٹھاتا، لہذا جب اس کے نقصان رساں پہلو کا ذمہ دار ہے تو منفعت بخش پہلو بھی اسی کے حق میں ہونا چاہیے۔ علاوہ بریں اگر بائع کو اس نفع کا حق دار ٹھیرایا جائے تو فریقین کے درمیان نفع کی کمی و زیادتی پر جھگڑا پیدا ہونے کا قوی اندیشہ ہے لہذا قطع نزاع کے لیے بھی مصلحت کا تقاضا یہی ہے کہ اس حق کا حقدار خریدار ہی کو قرار دیا جائے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس میں اصولی بات یہ ہے کہ "نفع کا تعلق ہمیشہ نقصان کی ذمہ داری کے ساتھ رہے گا۔"

(۳) "اگر فریقین (بائع اور مشتری) میں باہم کسی بات پر اختلاف پیدا ہو جائے اور شے فروختنی قائم اور اپنی اصلی حالت پر موجود ہو اور کسی فریق کے پاس اپنے دعوی پر کوئی دلیل نہ ہو تو ایسی صورت میں بائع کی بات مانی جائیگی الا آنکہ دونوں کسی نقطہ پر مجتمع ہو جائیں"۔ یہ شارع کا مقرر کیا ہوا اصول ہے۔ جس کے ذریعہ اس نے جھگڑے کا دروازہ بند کر دیا ہے۔ اس قاعدہ کی بنا اس پر ہے کہ "کوئی چیز اپنے مالک کے قبضہ سے صرف اسی صورت میں نکل سکتی ہے جب کہ فریقین کی باہمی رضامندی کے ساتھ معاملہ بیع طے ہو جائے"۔ اب چونکہ یہاں یہ صورت حال نہیں پائی گئی اور رضا کے بجائے آپس میں اختلاف رونما ہو چکا ہے اس لیے معاملہ کو ختم سمجھ کر مندرجہ بالا اصل کی طرف رجوع کرنا ضروری ٹھیرا یعنی وہ چیز بائع کی سمجھی جائیگی اور اس کی قیمت وہی مانی جائیگی جو بائع کہتا ہے۔ ہاں خریدار کو البتہ یہ اختیار ہے کہ اس قیمت پر چاہے چیز لے یا نہ لے۔ کیونکہ معاملہ بیع کے انعقاد کے لیے جس طرح فریق اول (بائع) کی رضا شرط ہے اسی طرح فریق ثانی (خریدار) کی بھی شرط ہے۔

(۴) اگر کوئی شخص بیع سلم کے طور پر کوئی چیز خریدے تو اس کے لیے ضروری ہے کہ اس چیز کی مقدار اور قبضہ کرنے کے وقت کی تعیین کر دے۔ رسول اللہ صلعم جب مدینہ تشریف لائے تو لوگوں میں اس طرح کی بیع کا بڑا رواج تھا۔ لوگ روپیہ پیشگی دیدیتے اور دو دو تین تین سال بعد پیدا ہونے والے پھلوں کو خرید لیتے۔ آپ نے اسے بالکلیہ ممنوع تو نہیں کیا البتہ اتنی شرط لگادی کہ اس چیز کی مقدار یا وزن متعین ہو۔ نیز یہ صاف صاف طے ہو جائے کہ بائع کس وقت خریدار کو وہ چیز دے گا۔

(۵) قرض کے بین دین میں تحریری دستاویز اور شہادت کی سخت تاکید ہے چنانچہ قرآن میں ہے:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ الآیۃ	اے ایمان لانے والو جب تم کسی مدت معین تک کے لیے ایک دوسرے سے قرض لو تو اسے لکھ لیا کرو۔

© rasailojaraid.com

قرض کا معاملہ معاشی امور میں گوناگوں حیثیتوں سے بڑی اہمیت رکھتا ہے - ایک طرف معاشی ضروریات کے پیش نظر قرض کے بغیر کوئی چارۂ کار نہیں، دوسری طرف یہ دیگر معاملات کی بہ نسبت بہت زیادہ نزاع آفریں اور خصومت انگیز ہے - اسی اہمیت کی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے خصوصیت کے ساتھ قرض کے معاملات پر گواہ بنانے اور انھیں ضبطِ تحریر میں لانے کی سخت تاکید فرمائی ہے اور کتمان شہادت کی سخت ممانعت کر دی ہے - پھر اسی ضمن میں نیز انھیں معاشی ضرورتوں کے باعث رھن اور کفالۃ وغیرہ معاملات کی بھی اجازت دے دی ہے -

مضاربت یا شرکت کے معاملات اوپر بیان کیا جا چکا ہے کہ نسل انسانی مدنی الطبع واقع ہوئی ہے اور اس کا معاشی سوال اس وقت تک حل نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کے افراد میں باہم تعاون نہ موجود ہو - چنانچہ تاریخ تمدن بتلاتی ہے کہ یہ معاشی تعاون مختلف شکلوں میں قوموں کے اندر ہمیشہ موجود رہا ہے - اس تعاون اور اشتراک کی مندرجہ ذیل قسمیں ہو سکتی ہیں:

(۱) دو آدمی کوئی تجارتی کاروبار اس طرح پر شروع کریں کہ ایک کا سرمایہ ہو اور دوسرے کی محنت اور منافع حسب معاہدہ دونوں تقسیم کرلیں - اسے اصطلاح میں "مضاربت" کہتے ہیں -

(۲) دو آدمی مل کر اس طرح تجارت کریں کہ سرمایہ میں دونوں برابر کے شریک ہوں، ہر ایک جو کچھ بیچے یا خریدے دوسرا بھی اس میں شریک ہو، حتیٰ کہ دونوں ایک دوسرے کے ضامن اور ایک دوسرے کے مختار عام ہوں اور بیوپار میں جو نفع ہو اسے دونوں آپس میں بحصہ مساوی تقسیم کرلیں - اس کا نام "شرکت مفاوضہ" ہے -

(۳) دو آدمی کسی معین سرمایہ سے تجارت کریں جس میں دونوں کے حصے برابر ہوں اور ہر ایک اس سرمایہ کی حد تک خرید و فروخت میں دوسرے کا قائم مقام ہو - لیکن ایک دوسرے کا ضامن اور کفیل عام نہ ہو کر محض شریک کار رہنے کی وجہ سے جو کچھ ایک پر بار ہو وہ دوسرے سے طلب کیا جا سکے - "اسے شرکت عنان" کہتے ہیں -

© rasailojaraid.com

(۴) دو آدمی اس طرح تجارت شروع کریں کہ سرمایہ کسی ایک کا بھی نہ ہو بلکہ ہر ایک محض اپنی ذاتی شخصیت سے کام لیکر بازار سے ادھار مال حاصل کرے اور دونوں مل کر اسے بیچیں اور قرض ادا کرنے کے بعد نفع باہم تقسیم کرلیں اس کا نام اصطلاح شرع میں "شرکت وجوہ" ہے۔

(۵) ایک شخص اپنے لیے نہیں بلکہ کسی دوسرے کے لیے معاملات کرے۔ اسے "وکالت" کہتے ہیں۔

(۶) دو صنعت پیشہ آدمی مل کر کام کریں اور جو کچھ حاصل ہو آپس میں بانٹ لیں۔ یہ "شرکت عمل ہے"

(۷) ایک شخص کے باغ کی دیکھ بھال اور آبپاشی دوسرا آدمی کرے اور اس باغ سے جو پھل پیدا ہوں وہ ان میں سے حصہ بٹائے۔ اسے آئین اسلامی میں "مساقاۃ" کہتے ہیں۔

(۸) زمین اور بیج ایک آدمی کا ہو اور ہل بیل تیز کاشت کرنے کی جملہ محنت دوسرے آدمی کی۔ اس طرح جو غلہ پیدا ہو اس میں دونوں شریک ہوں۔ اس کا نام "مزارعۃ" ہے۔

(۹) ایک شخص کی محض زمین ہو اور بیج، ہل اور بیل اور محنت سب دوسرے کی ہو۔ اسے "مخابرہ" کہتے ہیں اور یہ دراصل مزارعۃ ہی کی ایک قسم ہے۔

(۱۰) مزارعت ہی کی ایک شکل یہ بھی ہے کہ زمین، بیج اور ہل اور بیل سب کچھ ایک ہی آدمی کا ہو اور دوسرے کی صرف محنت ہو۔

معاشی تعاون اور اشتراک عمل کی یہ تمام صورتیں اور اسی نوعیت کی دوسری صورتیں بھی اسلام میں جائز ہیں، اور ان کے لیے یہ قاعدہ مقرر کیا گیا ہے کہ فریقین میں جو شرائط طے ہو جائیں انکی پوری پابندی کی جائے، بجز ایسے معاہدہ اور ایسی شرائط کے جو حلال کو حرام یا حرام کو حلال کرنے والی ہوں۔

معاملات میں فضل اور فیاضی یہاں تک جو اصولی قوانین بیان ہوئے ہیں ان کا تعلق معاشی معاملات میں خود غرضی، ظلم و عدوان اور نزاع کی روک تھام سے تھا۔ لیکن اسلام نے صرف اتنے ہی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اس نے معاشی معاملات میں فضل، فراخ دلی، فیاضی، ایثار اور امداد باہمی کی روح پیدا کرنے کی کوشش کی ہے اور احسان و تبرع کو بھی معاشیات

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کا اہم ترین جزو بنا دیا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے شارع کا یہ ارشاد ملاحظہ ہو:

رحم اللہ رجلا سمحا اذا باع واذا اشتریٰ واذا اقتضیٰ

اللہ کی رحمت ہو اس شخص پر جو خریدتے اور بیچتے اور قرض کا تقاضا کرتے وقت مروت اور خوش خلقی سے کام لے۔

کج خلقی اور خود غرضی و بے مروتی کاروباری ذہنیت کا گویا ایک فطری خاصہ ہے لیکن چونکہ ایک طرف تاجر کے نفس پر اس کے برے اثرات پڑتے ہیں، دوسری طرف نظام تمدن کے حق میں یہ موت سے کم نہیں، کیونکہ یہ چیز تعاون کی دشمن ہے اور تعاون ہی پر مدنیت کا دارومدار ہے، اس لیے رسول اللہ صلعم نے اپنے مؤثر طریقہ پر اس سے روک کر سماحت اور فراخدلی کی ترغیب دی ہے۔

اسی مقصد کے لیے ایک موقع پر آپ نے لوگوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا کہ "جو شخص کسی ایسی بیع کو جسے اس کا بھائی (خریدار) ناپسند کرتا اور فسخ کرنا چاہتا ہو، فسخ کر دے گا قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو فسخ (یعنی معاف) کر دے گا"۔ معاملہ کی بات تو یہ ہے کہ جب خریدار نے اپنی رضا و رغبت سے ایک چیز خرید لی ہے تو خواہ بعد میں وہ کتنا ہی پچھتائے اور اسے واپس کرنا چاہے، بائع واپس کرنے پر مجبور نہیں ہے۔ لیکن چونکہ ایک بھائی کو اس سے نقصان پہنچ رہا ہے اس لیے آنحضرت صلعم نے بیع کو فسخ کرنے کی ان الفاظ میں اپیل فرمائی اور اسے رحمت و مغفرت ایزدی کا ذریعہ بتلایا۔ (بشرطیکہ چیز اپنی اصلی حالت میں ہو)

اگر دو قریبی رشتہ دار ایک ہی شخص کی ملکیت میں ہوں تو اس کے لیے جائز نہیں کہ ایک کو بیچ دے اور دوسرے کو اپنے پاس رکھ چھوڑے۔ حضرت علیؓ نے ایک مرتبہ ایسا کیا تھا۔ آنحضرت صلعم نے فرمایا کہ بیع کو فسخ کر کے غلام کو واپس لے لو۔ ایک موقع پر آپ نے فرمایا کہ "جو شخص ماں اور اس کے بیٹے کو الگ الگ کرے گا اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس کو اور اس کے احباب و اقارب کو الگ الگ کر دے گا"۔ یہاں بھی وہی اصول اخلاق و سماحت کام کر رہا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی احسان اور تبرع کی تعلیم دیتے ہوئے آنحضرت صلعم فرماتے ہیں کہ "اگر کوئی خریدار قیمت ادا کرنے سے پیشتر مفلس ہو جائے اور قیمت ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو بائع کو چاہیے کہ اپنی چیز کو واپس لے لے اور اسے قیمت ادا کرنے پر مجبور نہ کرے۔" اسی طرح آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ "اگر قرض دار تنگ دست ہو جائے تو قرض خواہ کو اپنا قرض معاف کر دینا چاہیے یا کم از کم مطالبہ میں نرمی برتنے اور اسے ادا کرنے کی کافی مہلت دے اللہ تعالیٰ اس کو روزِ جزا کے اہوال سے محفوظ رکھے گا۔"

اس کے برعکس اگر قرض دار قرض ادا کرنے کی قدرت رکھتا ہو اور پھر قرض ادا کرنے میں ٹال مٹول کرتا ہو تو دوسروں کو چاہیے کہ اس پر دباؤ ڈال کر حساب بیباق کرائیں۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ "تونگر کا ادائیگی قرض میں لیت و لعل کرنا ظلم و ناانصافی ہے۔ ہاں اگر قرض دار کسی دوسرے شخص کا حوالہ دے تو اس کا حوالہ قبول کر لینا چاہیے۔" اس دوسرے ٹکڑے کا مطلب یہ ہے کہ اگر قرض دار کا روپیہ کسی دوسرے پر آتا ہو اور وہ قرض خواہ سے کہے کہ تم اس سے وصول کر لو، تو ایسی صورت میں قرض خواہ کو یہ اصرار نہ کرنا چاہیے کہ میں تو تجھی سے وصول کروں گا۔

اسی تبرع کی خاطر قرآن نے مسلمانوں کو بار بار صدقات پر ابھارا ہے اور حکم دیا ہے کہ جو مال اللہ نے انھیں دیا ہے اس میں سے اپنے غریب اور نادار بھائیوں پر بھی خرچ کریں، اور اس کے عوض رضائے الٰہی کے ماسوا کوئی معاوضہ ان کے پیش نظر نہ ہو۔ پھر ایک ایک چیز کو گنا کر بتا دیا کہ ان صدقات کو ان کے صحیح مصارف میں خرچ کرنا ضروری ہے۔ وہ مصارف یہ ہیں:

إِنَّمَا الصَّدَقَاتُ لِلْفُقَرَاءِ وَالْمَسَاكِينِ وَالْعَامِلِينَ عَلَيْهَا وَالْمُؤَلَّفَةِ قُلُوبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغَارِمِينَ وَفِي سَبِيلِ اللَّهِ وَابْنِ السَّبِيلِ الخ۔ (توبہ - ۸)

صدقات تو محض فقیروں، مسکینوں، محصلین زکوٰۃ، کمزور ایمان والے نو مسلموں (جن کی تالیف قلب کی ضرورت ہو) اور غلاموں، قرضداروں، راہ خدا میں جہاد کرنے والوں اور مسافروں کے لیے ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن صدقات کے ذریعہ سے صرف غربا اور حاجت مندوں ہی کے ساتھ احسان اور مواساۃ کا مظاہرہ کیا جاسکتا ہے۔ کھاتے پیتے مسلمانوں کے ساتھ اظہار اخوت و مواساۃ کا ذریعہ وہ نہیں بن سکتے۔ اس لیے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے شارع نے ہدیہ اور تحفہ بھیجنے کی تلقین کرکے ہر امیر اور غریب کے ساتھ رشتۂ اخوت و مودّت کو مضبوط کرنے کی ترغیب دی۔ رسول اللہ صلعم کا فرمان ہے کہ تھادوا فان الھدیۃ تذھب الضغائن (ایک دوسرے کے یہاں ہدیئے بھیجو، کیونکہ ہدیہ دلوں کو کینوں سے صاف کرتا ہے) اور یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ہدیہ خواہ کتنا ہی قلیل اور ادنیٰ درجہ کا کیوں نہ ہو لیکن وہ اس بات کی علامت ہے کہ ہدیہ بھیجنے والا اپنے دل میں اسکی جگہ رکھتا ہے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو سامنے رکھ کر شارع نے ہدیہ واپس کرنے کی سخت ممانعت فرمائی ہے خواہ وہ کتنا ہی حقیر کیوں نہ ہو۔

صدقہ اور ہدیہ میں فرق یہ ہے کہ صدقہ محض لوجہ اللہ ہوتا ہے اور ہدیہ دیکر اس شخص کی خوشنودی حاصل کی جاتی ہے۔ اور یہ چیز بھی انسانیت اور مصالح تمدن دونوں کے لیے اکسیر حیات کا حکم رکھتی ہے کیونکہ اس کے ذریعہ سے سوسائٹی کے افراد میں الفت اور اتحاد کی زبردست اسپرٹ پیدا ہوتی ہے۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ "جس شخص کے پاس ہدیہ آئے، اگر وہ صاحب استطاعت ہے تو چاہیے کہ وہ بھی اس کا جواب دے اور اگر استطاعت نہیں رکھتا تو ہدیہ دینے والے کے حق میں خیر و تحسین کے کلمات کہدے۔ ایسا کرنا گویا اس کی ہمدردی کا شکریہ ادا کرنا ہو جائیگا۔ لیکن جس نے یہ بھی نہ کیا اس نے سخت ناشکری کی۔ اور جس نے ہدیہ دینے میں اپنی حیثیت سے بہت بڑھ چڑھ کر نمائش کی اسکی مثال اس ریاکار رند کی سی ہے جس نے سر سے پیر تک خرقۂ زہاد پہن رکھا ہو۔"

ہدیہ کے جواب میں ہدیہ بھیجنے میں ایک تو یہ مصلحت ہے کہ اس طرح دونوں جانب سے قربت و الفت کی پیش کش ہوگی جو ہدیہ کا مقصد وحید ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اوپر کا ہاتھ تو بہرحال نیچے کے ہاتھ سے افضل ہے اس لیے انسان کو کوشش کرنی چاہیے کہ اس کا ہاتھ نیچا نہ رہ جائے۔ لیکن اگر واقعی وہ اسکی قدرت نہیں رکھتا تو کم

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے کم اسے اچھے کلمات سے یاد ہی کرے کہ یہ چیز بھی انجام کے لحاظ سے ہدیہ دینے کے برابر ہی ہے۔ لیکن اچھے کلمات سے یاد کرنے کا مطلب یہ بھی نہیں ہے کہ بیٹھے کرنا اور تعریفوں کے پل باندھنا شروع کر دے۔ اس کا معتدل طریقہ بھی شریعت نے متعین فرمادیا ہے چنانچہ ایک حدیث میں آتا ہے کہ وہ جس شخص پر کوئی احسان کیا گیا ہو اور وہ اپنے محسن کو جزاک اللہ خیرا کہہ دے تو اس نے تحسین و ثنا کا زیادہ سے زیادہ حق ادا کر دیا" شریعت کا مقرر کیا ہوا یہ طریقۂ اظہار تشکر اسلامی نقطۂ نظر سے اپنے اندر انتہائی مناسبت، جامعیت اور اعتدال رکھتا ہے اس پر اضافہ کرنا جس طرح تملق اور دنائت کی دلیل ہے اسی طرح اس میں بھی بخل کرنا انتہائی بداخلاقی اور کفران نعمت ہے۔

ہدیہ دے کر واپس لے لینا نہایت ہی ذلیل اور مکروہ حرکت ہے۔ رسول اللہ صلعم فرماتے ہیں کہ "کسی چیز کو ہبہ کر کے پھر اسے واپس لے لینے والے کی مثال اس کتے کی سی ہے جو قے کر کے اسے چاٹے، ہم (مسلمانوں) کو ایسی بری حرکت زیب نہیں دیتی"۔ غور کرو یہ مثال کس قدر مبنی بر حقیقت ہے۔ جب ایک شخص اپنی مرضی سے اپنے مال کا ایک حصہ کسی کو ہبہ کر دیتا ہے اور پھر اسے لوٹانا چاہتا ہے، تو آخر کونسی چیز اسے اس فعل پر آمادہ کر رہی ہے؟ ظاہر ہے یا تو وہ انتہائی تنگ دل اور خسیس ہوگا اور کسی اتفاقی جذبہ سے متاثر ہو کر ایک چیز ہبہ کرنے کے بعد اسے اپنی حرکت پر افسوس آیا ہوگا اور اب اسے واپس مانگ رہا ہے، یا اس شخص کو، جسے اس نے ہبہ کیا تھا، تنگ کرنا اور اسے نقصان پہنچانا مقصود ہوگا۔ ان دونوں وجوہ میں سے خواہ کوئی وجہ بھی ہو ہر ایک کا منشا اور منبع بداخلاقی اور خفت ہی ہے۔ علاوہ ازیں معاشرتی مصالح کے حق میں ہدیہ دینا اتنا مفید نہیں جتنا اس کا واپس لینا ان کے حق میں مضر ہے۔ اس سے اس شخص کے دل میں نفرت کی آگ بھڑکے بغیر نہیں رہ سکتی۔ وہ اسے اپنی سخت ہتک تصور کرے گا اور اس تصور سے اس کا مشتعل ہو جانا بلکہ انتقام پر اتر آنا یقینی ہے۔ اسی اندیشہ اور خطرہ کی وجہ سے کسی شخص کے لیے ــــ اگر اس کے کئی بیٹے ہوں ــــ جائز نہیں کہ ایک لڑکے کو کوئی چیز ہبہ کرے اور دوسروں کو یونہی چھوڑ دے۔ اگر وہ ایسا کرتا ہے تو گویا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سگے بھائیوں کو باہم دشمن بنا تا ہے۔

وصیت وصیت کا رواج ہر ملک اور قوم میں رہا ہے۔ اہلِ اسلام کو بھی اسکی اجازت دی گئی ہے۔ لیکن چند قانونی پابندیوں کے ساتھ۔

(۱) آدمی اپنے کسی وارث کے حق میں وصیت نہیں کرسکتا۔ حدیث میں آتا ہے کہ لاوصیة لوارث (وارث کے لیے وصیت نہیں ہے) اور اس کے ساتھ ہی اس کی علت بھی بیان فرما دی گئی ہے ان اللہ اعطی لکل ذی حق حقہ (کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر حقدار یعنی وارث کا حق خود ہی متعین کر دیا ہے)۔ اہل جاہلیت وصیت کے بارے میں بڑی ہی افراط و تفریط سے کام لیتے تھے۔ وقتی جذبات سے مغلوب ہو کر حق اور مصلحت کا سر رشتہ ہاتھ سے چھوڑ دیتے اور واقعی حقدار کو اس کے حق سے محروم کر کے دور کے لوگوں کے لیے سارا مال وصیت کر جاتے۔ اس کم بینی اور ناحق شناسی کا دروازہ بند کرنا ضروری تھا۔ پھر اس کی جگہ ایک متوسط اور متوازن اور مصالح تمدن سے موافق طریقہ متعین کرنے کے لیے یہ بھی ضروری ہوا کہ وصیت کا زیادہ مستحق ان متعلقین کو ٹھیرایا جائے جو رحمی رشتہ رکھتے ہوں بمقابلہ ان لوگوں کے جو محض عارضی اسباب کی وجہ سے قریب ہو گئے ہوں۔ لیکن جب قرآن نے میراث کے مفصل اور متعین احکام نازل فرما دیے اور ہر ایک وارث کا حصہ یہ کہکر متعین کر دیا کہ "یہ اللہ تعالیٰ کی قائم کی ہوئی حدود ہیں ان میں کمی بیشی نہ ہونے پائے، اللہ نے میراث کی اس تقسیم میں معاشرت اور تمدن اور قرابت کے جن مصالح اور حِکَم کو مرعی رکھا ہے ان کی کُنہ تک تمہاری نگاہیں نہیں پہنچ سکتیں"۔ تو پھر کسی وارث کے حق میں وصیت کا کوئی موقع ہی نہیں رہا ورنہ خدا کی حدود ٹوٹ کر رہینگی وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ نیز اس سے یہ بھی خطرہ ہے کہ وارثوں کے درمیان بغض اور عداوت کا ایک خوفناک جذبہ پیدا ہو جائے گا کیونکہ ہر وارث چاہتا ہے کہ مجھے زیادہ سے زیادہ حصہ ملے۔ شریعت نے میراث کا قانون منضبط کر کے ان کی ان متصادم خواہشوں کے مفاسد کا سدّ باب کر دیا ہے۔ اب اگر کوئی شخص اپنے ایک خاص رشتہ دار کے حق میں وصیت کرتا ہے تو گویا دوسرے ورثہ کو اس کے خلاف نفرت اور بغض و حسد پر ابھارتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(۲) وارثوں کے لیے کم از کم دو تہائی مال چھوڑنا ضروری ہے۔ وصیت کرنے والے کو زیادہ سے زیادہ اپنے مال کا ایک تہائی حصہ وصیت کے ذریعہ سے غیر وارث لوگوں کو دینے کا حق دیا گیا ہے۔ سعدؓ بن ابی وقاص نے ایک مرتبہ بارگاہ رسالت میں عرض کیا کہ میں بہت بڑی دولت کا مالک ہوں، صرف ایک لڑکی ہے جس کے علاوہ اور کوئی میرا وارث نہیں، تو میں کسقدر مال کی وصیت کر سکتا ہوں؟ کیا تمام مال کی یا نصف کی یا ثلث کی؟ آنحضرت صلعم نے فرمایا "ایک تہائی کی وصیت کر دو اور وہ بہت ہے تمہارا اپنے وارثوں کو خوشحال چھوڑ جانا اس سے بہتر ہے کہ تم انہیں اس حال میں چھوڑو کہ وہ لوگوں پر بار رہوں۔"

مال متروکہ کے اصل وارث اور مستحق تو فطرتاً اور رواجاً اس کے قریبی رشتہ دار ہیں، اگر وہ دوسروں کے لیے اپنے مال کی وصیت کر جاتا ہے تو اقربا کی کتنی بڑی حق تلفی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ خود حکمتِ تمدن کا مقتضی ہے کہ مرنے کے بعد میت کا ترکہ وہی لوگ پائیں جو دنیا میں اس کے سب سے زیادہ قریب، سب سے زیادہ خیر سگال، سب سے زیادہ ہمدرد اور مددگار رہے۔ اور ان باتوں میں باپ بیٹے وغیرہ جیسے ذوی الارحام سے بڑھکر اور کون ہو سکتا ہے چنانچہ اسی لیے قرآن میں آتا ہے کہ وَاُولُوا الْاَرْحَامِ بَعْضُهُمْ اَوْلٰى بِبَعْضٍ فِيْ كِتٰبِ اللّٰهِ (اللہ کی کتاب یعنی قانون میں رحمی رشتہ رکھنے والے ایک دوسرے کے زیادہ قریبی اور یگانہ ہیں۔) اس لحاظ سے تو تمام ترکہ ورثہ ہی کو ملنا چاہیے۔ مگر معلم حکمت کی نگاہ حقیقت بین وقتی اور خارجی مصالح کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتی تھی۔ فرض کرو کسی کی تربیت میں کوئی یتیم بچہ ہے، یا کسی کے ایسے غریب رشتہ دار ہیں جنہیں از روئے قانون وراثت نہیں پہنچتی۔ کیا وجہ ہے کہ ان کی مدد کا دروازہ بند کر دیا جائے؟ اسی طرح اگر کوئی دولتمند آدمی اپنے چھوڑے ہوئے مال میں سے ایک حصہ رفاہِ عام کے کاموں میں صرف کرنا چاہتا ہو تو کیوں اس کو ایسے نیک کام سے روکا جائے؟ پس شریعت میں دونوں پہلوؤں کے درمیان پورا توازن قائم کیا گیا ہے۔ نہ جائز حق دار اپنے حق سے محروم کیے جا سکتے ہیں، اور نہ فضل و احسان ہی کا دروازہ بند ہوتا ہے۔

(۳) وصیت کرنے والے کو چاہیے کہ آخری وقت کا انتظار نہ کرے بلکہ وصیت لکھ کر محفوظ کر دے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حدیث میں مذکور ہے کہ کسی مسلمان کے لیے مناسب نہیں ہے کہ وہ ایک رات اس حال میں گذار دے کہ اس کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس کے بارے میں وہ وصیت کرنا چاہتا ہو اور وہ وصیت اس نے لکھ نہ دی ہو۔ اس حکم کی وجہ بالکل عیاں ہے۔ بہت ممکن ہے کہ صبح تک وہ اس دنیا میں نہ رہے اور جن مصالح اور مقاصد کے لیے اس نے وصیت کا ارادہ کیا ہے وہ فوت ہو جائیں۔[1]

وقف تبرعات ہی کی ایک قسم وقف بھی ہے۔ اب تک تعاون و تبرع کی جتنی صورتیں بیان ہو چکی ہیں وہ سب کی سب کسی نہ کسی شکل میں قبل اسلام بھی رائج تھیں۔ لیکن وقف کا طریقہ بالکل نامعلوم تھا۔ یہ شارع اسلام علیہ السلام کا مخصوص اجتہاد ہے، جس کے اندر نظام معیشت و معاشرت کے ایسے مصالح پوشیدہ ہیں جو دیگر اقسام صدقات و تبرعات سے حاصل نہیں ہو سکتے۔ ایک شخص خواہ کتنا ہی بڑا فیاض ہو، فقراء و مساکین کے

---

[1] ترجمان القرآن۔ اس موقع پر قرآن مجید کی یہ آیت بھی پیش نظر رکھنی چاہیے:

کُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ۔

جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت آ جائے اور اس نے اپنے والدین اور اقرباء کے لیے اچھا خاصا مال چھوڑا ہو تو اس پر فرض کیا گیا ہے کہ احسان کے طور پر اس مال میں سے کچھ وصیت کرے۔ یہ حق ہے پرہیزگاروں پر۔

اس آیت میں خیر (یعنی اچھے خاصے مال) سے مراد اتنا زیادہ مال ہے جس میں سے تمام وارثوں کو کافی حصہ پہنچنے کے باوجود ایک معتدبہ حصہ بچ سکتا ہو۔ مال کم ہونے کی صورت میں وصیت نہیں ہے۔ چنانچہ حضرت علیؓ سے منقول ہے کہ ایک مرتبہ آپ اپنے ایک عزیز کی عیادت کو تشریف لے گئے۔ انہوں نے پوچھا "کیا میں وصیت کروں"؟ حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ "اللہ تعالیٰ نے اِن ترك خیرًا کی شرط لگائی ہے۔ تم کچھ بہت مال تو رکھتے ہی نہیں تھوڑا سا مال ہے۔ وہ اپنی اولاد کے لیے چھوڑ دو"۔ البتہ مال زیادہ ہونے کی صورت میں بعض کے نزدیک مستحب اور بعض کے نزدیک واجب ہے کہ ایک حصہ (جو ایک تہائی سے زیادہ نہ ہو) کسی کار خیر میں صرف کرنے کے لیے وصیت کر دی جائے۔ اور آیت کے الفاظ ان لوگوں کے قول کی تائید کرتے ہیں جو وصیت کو واجب قرار دیتے ہیں (کتب علیکم۔ اور حقًا علی المتقین)۔ ابن عباس اور حسن بصری اور بعض دوسرے اکابر صحابہ و تابعین وجوب ہی کے قائل ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیے صدقہ کر دے لیکن یہ ظاہر ہے کہ ایک مدت مخصوص کے بعد وہ فوراً ختم ہو جائیگا اور ان فقراء کے بعد جو حاجت مند ہونگے وہ اس صدقہ عامہ سے کوئی حصہ نہ پا سکیں گے۔ پس مقاصد کے کمال حصول اور رفاہِ خلق کی عمومیت کے لحاظ سے صدقہ کی اس شکل سے بہتر کوئی شکل نہیں ہو سکتی کہ کوئی مال یا جائداد غربا و مساکین اور دیگر حاجت مندوں کے حق میں اس طور پر بخش دی جائے کہ اصل ہمیشہ اپنی حالت پر باقی رہے، اس میں سے کچھ بھی خرچ نہ ہو اور محض اس کے منافع سے حاجت مندوں کی حاجت روائی ہوتی رہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو آنحضرتؐ نے ان الفاظ میں وقف کی اجازت مرحمت فرمائی تھی:

ان شئت حبست اصلها — اگر تم چاہو تو اس (مال یا جائداد) کی اصل روک لو

وتصدقت بها — اور اس کا (یعنی اس کے منافع) کا صدقہ کر دو۔

چنانچہ حضرت عمرؓ نے یونہی کیا اور اس جائداد کو اس شرط پر وقف کر دیا کہ نہ تو وہ بیچی جاسکے گی نہ ہبہ کی جا سکے گی نہ اس میں میراث جاری ہوگی، بلکہ محض اس کے منافع فقیروں (حاجت مند) قرابت داروں، غلاموں، مسافروں اور مہمانوں اور دیگر شرعی ضروریات پر خرچ کیے جائیں گے۔ اس کا متولی اگر حسب دستور اس کی آمدنی میں سے خود بھی کچھ اپنے لیے لے لیا کرے تو اس کے لیے جائز ہے۔

سید البشر مؤلفہ مولوی ابو سعید عبد الرحمٰن صاحب فرید کوٹی۔ اس کتاب میں فاضل مؤلف نے بائیبل سے نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور کی پچاس پیشگوئیاں جمع کی ہیں۔ ان میں سے کچھ نہایت صاف و صریح ہیں اور کچھ مجمل، جن میں آنے والے نبی کی محض علامات اور نشانیاں اور کچھ حالات بتائے گئے ہیں اور ثابت کیا گیا ہے کہ ان کا مصداق ذاتِ پاک مصطفوی کے علاوہ اور کوئی نبی نہیں ہو سکتا۔ یہ کتاب عیسائیوں میں پھیلانے کے لیے نہایت مفید ہے اور مبلغین اسلام کو بھی اس سے بے نیاز نہ رہنا چاہیے نیز جن لوگوں کو عیسائیوں سے گفتگو کا موقع ملتا ہے ان کے پاس اس کتاب کا رہنا بے حد ضروری ہے۔ قیمت ۶/

ملنے کا پتہ: دفتر ترجمان القرآن۔ ملتان روڈ۔ لاہور

© rasailojaraid.com